اسلامی تحریکات: مستقبل اور مقاصدِ شریعت

ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی ○

یہ حقیقت واضح ہے کہ پروردگارِ عالم نے کرّہ ارض پر انسانوں کو بسا کر یہ دیکھنا چاہا ہے کہ کون بندگی کا راستہ اختیار کرتا ہے اور کون سرکشی دکھاتا ہے؟ اللہ تعالیٰ بندگی اختیار کرنے والوں کو دائمی فلاح و کامرانی سے نوازیں گے اور سرکشی دکھانے والوں کو سزا دیں گے۔ دنیوی زندگی کو اس امتحان کے لیے سازگار بنانے کی خاطر شریعت دی گئی، تاکہ زندگی کا نظم و نسق بھی چلے اور افراد کی آزادیِ اختیار بھی باقی رہے۔ یہاں پر ہم اس بات پر غور کریں گے کہ مقصدِ تخلیق اور مقاصدِ شریعت کی روشنی میں اسلامی تحریکات کا کیا رول ہونا چاہیے؟ اسلامی تحریکات سے ہماری مراد وہ تحریکات ہیں جو گذشتہ دو سو سال سے سرگرم کار ہیں اور اسلام اور مسلمانوں کے [سیاسی] زوال کو عروج سے اور مغلوبیت کو اسلام کے غلبے سے بدلنا چاہتی ہیں۔ چوں کہ اس سوال کا جواب (کہ اسلامی تحریکات کیا طریق کار اختیار کریں؟) آنے والے دنوں سے متعلق ہے، اس لیے پہلے ہم یہ دیکھنا چاہیں گے کہ مستقبل کیسا ہوگا؟

آنے والے حالات

یہ ایک فطری خیال ہے کہ آنے والے دن گزرے دنوں سے مختلف ہوں گے، ہم مل جل کر سوچیں کہ کیوں اور کس حد تک مختلف ہو سکتے ہیں؟ اور یہ کہ اپنا انداز کار بدل کر نئے حالات میں کس طرح

○ نام وَر ماہر اسلامی معاشیات ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی صاحب کی یہ تحریر سوچ بچار کے عمل میں وسعت لانے کی ایک تجویز ہے، کوئی فتویٰ نہیں۔ اس تحریر میں مسلم اکثریتی اور مسلم اقلیتی معاشروں میں اسلامی تحریکات کو پیش آمدہ مسائل و معاملات کو لگے بندھے اسلوب سے ہٹ کر زیر بحث لانے کی دعوت ہے۔ یہاں پیش کردہ بعض مقدمات پر ادارہ ترجمان کو بھی تحفظ ہے۔ تاہم، عصرِ حاضر میں دعوتِ مبارزت دیتے بعض خدشات، ابہامات اور امکانات کو دیکھنے اور غور کرنے کے لیے بہرحال اس تحریر سے مدد ملتی ہے۔ قارئین بھی اسی نظر سے ملاحظہ فرمائیں۔ (ادارہ)

نئے طریقے اختیار کر سکتے ہیں؟ اس امید کے ساتھ کہ بدلے ہوئے طریقے تحریک اسلامی کو اپنے مقصد، یعنی اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی کی طرف بلانے میں کامیابی کی طرف لے جائیں گے۔

سب سے پہلے ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آنے والے دنوں میں دنیا آج کی دنیا سے کن باتوں میں مختلف ہوگی؟ آبادی بڑھے گی، دیہات سے شہر منتقلی بڑھے گی، مواصلات اور نقل وحمل کی تیزی بڑھے گی، ہر ملک میں مختلف رنگ ونسل کے لوگ اور مختلف مذاہب کے ماننے والے ایک ساتھ رہیں گے، غریبی اور محتاجی کم ہوگی، مگر دولت اور آمدنی میں فرق بڑھتا جائے گا۔ حکمرانی میں عوام کی شرکت بڑھے گی، مقامی حکومت اور بین الاقوامی اداروں کا رول بڑھے گا، قومی حکومتوں کا عمل دخل اور دور دورہ کم ہوگا۔ خاندان کی گرفت ڈھیلی پڑتی جائے گی، اوسط انسانی عمر میں اضافہ ہوگا، لوگ طویل عمر تک زندہ رہیں گے۔ صحتیں پہلے سے بہتر ہوں گی۔ ہر آدمی، مرد ہو یا عورت، اپنی فکر میں لگا رہے گا، خودغرضی بڑھے گی۔ باہمی تعاون میں کمی آئے گی۔ باہم لین دین کے معاملات درمیانی واسطوں کے بغیر براہ راست ہوں گے، (مثلاً انٹرنٹ کے ذریعے۔) زرِ نقد، کا استعمال کم سے کم ہوگا۔ بڑی کارپوریشنوں کا زوال ہوگا، مالیاتی لین دین (Finance) میں بھی بڑے اداروں کی جگہ جو درمیانی واسطوں کا کام کرتے ہیں، براہِ راست مالیات فراہم کرنے والوں اور مالیات کے ضرورت مندوں کے باہمی ربط کا رواج بڑھے گا۔ ماحولیاتی تحفّظات کے سبب شرحِ نمو کم ہوگی، ہوسکتا ہے معیارِ زندگی بھی کمی کی طرف مائل ہو۔

دنیا کی چودھراہٹ کی دوڑ اور بڑی طاقتوں کی باہمی کشاکش بڑھے گی یا کم ہوگی، کچھ کہنا مشکل ہے۔ اگرچہ امن عالم کے بارے میں کچھ کہنا اس سوال کا جواب دیے بغیر ممکن نہیں۔ رہا معاملہ عدل کا تو کوئی قطعی بات کہنا مشکل ہے۔ سماجی عدل کا انحصار نابرابری میں کمی اور کفالت عامّہ وشاملہ پر ہے، اور معاملات میں انصاف تب ہوتا ہے جب لوگ ایک دوسرے کے حقوق دینے کو تیار ہوں اور حکومت استحصالی ہونے کے بجاے عوام کی خدمت میں مخلص ہو۔ دونوں باتوں کا تعلّق اخلاقی اقدار اور روحانی تصوّرات سے ہے (زندگی کیوں، کہاں سے، کدھر کو؟) جب کہ باقی مذکورہ بالا باتوں کا تعلّق ٹکنالوجی سے ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ ٹکنالوجی بدلنے سے ہونے والی تبدیلیوں سے نمٹنے کے لیے کیا کرنا ہے اور دوسروں کے ساتھ عدل وانصاف سے پیش آنے کے لیے

لوگوں کو کیسے آمادہ کیا جائے؟ استحصالی حکمرانی کی جگہ خدمت گار حکمرانی لانے کا مسئلہ، مستقبل کے سیاق میں، خصوصی غور وفکر کا طالب ہے۔

تحصیل مقاصد اور مستقبل

اسلام [ایک بنیادی حد کے بعد] لوگوں کی آزادیاں برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ ٹکنالوجی ہو یا اس میں تبدیلی سے پیدا ہونے والے سماجی مسائل، اصولی طور پر لوگ آزاد ہیں جو چاہیں کریں۔ البتہ کچھ مقاصد ہیں جن کو سامنے رکھنا چاہیے، کچھ حدیں ہیں جن کے اندر رہنا ہوگا۔ یہ حدود اور مقاصد انسانوں کی اپنی بھلائی کے لیے ہیں۔ اس میں ایک اہم سوال یہ ہے کہ ان حدود و مقاصد کو جاننے کے لیے کن مآخذ کی طرف رجوع کیا جائے؟ دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ یہ حدود و مقاصد دائمی ہیں یا اُن میں تبدیلی ہوسکتی ہے؟ اگر ان میں لچک ہے تو اس کا معیار کیا ہے؟ ایک اور پہلو جو قابلِ توجّہ ہے، حدود اور مقاصد کے رول کو ایک دوسرے سے ممتاز کر کے سمجھنا ہے۔

مقاصد اور حدود

پہلے آخری سوال کو لیتے ہیں۔ یقیناً مقاصد مذکورہ حدود سے زیادہ اہم ہیں۔ اس لیے کہ انسانوں اور معاشروں اور تنظیموں کی جانب سے حدیں اصلاً مقرر کی گئی ہیں، مقاصد میں یک گونہ ہم آہنگی اور توازن پیدا کرنے اور مؤثر بنانے کے لیے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مقاصد دائمی ہیں مگر یہ وضعی حدیں لچک رکھتی ہیں۔ مقاصد میں اگر کوئی لچک ہے تو وہ درجۂ تحصیل سے متعلّق ہوگی (یعنی مقداری لچک) کہ خود مقاصد نہیں بدلتے۔ گویا مقاصد معیار کا درجہ رکھتے ہیں۔ وسائل کم ہوں تو درجۂ تحصیل کم ہوگا، وسائل فراواں ہوں تو درجۂ تحصیل زیادہ ہوگا۔ البتہ حدوں میں لچک مقداری (Quantitative) اور وصفی (Qualitative) دونوں طرح کی ہوتی ہے، تاکہ بدلتے حالات میں تحصیلِ مقاصد ممکن ہوسکے۔

ہم اس بات کو ایک مثال کے ذریعے واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔ سارے انسانوں کو کھانا پینا، کپڑا اور سر چھپانے کی جگہ ملے، یہ مقصود ہے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہر اس فرد کو، جو کام کرسکتا ہے محنت کرنا چاہیے۔ جو افراد کم عمری، بڑھاپے، یا کسی معذوری کی وجہ سے اپنی ضروریات

خود نہ پوری کر سکتے ہوں ان کی ذمّہ داری، پہلے قدم پر، خاندان کے قریبی ان رشتہ داروں پر ڈالی گئی ہے کہ جو اس کی قدرت رکھتے ہوں۔ جن خاندانوں میں اس فارمولے پر عمل سے کام نہ چلے، یا جب خاندان بکھر چکے ہوں (جیسا کہ آج کل دیکھنے میں آرہا ہے)، تو ان معذوروں اور ضرورت مندوں کے لیے اجتماعی بندوبست درکار ہے۔ اکثر حالات میں غیر سرکاری ادارے، مثلاً: یتیم خانے وغیرہ یہ ذمّہ داری سنبھال لیتے ہیں۔ آخری چارہ کار ریاستی طور پر ضرورت کی تکمیل ہے۔ ہر صورت میں ضرورت کی تکمیل کا معیار اس ملک یا آبادی کو میسّر وسائل پر منحصر ہے۔

اس ذمّہ داری کی ادائیگی کے لیے اسلام نے حکمراں کو امیروں سے، زکوٰۃ ناکافی ہونے کی صورت میں مزید ٹیکس لینے کا بھی اختیار دیا ہے (جہاں تک عمل کا سوال ہے، پندرہ سو برسوں میں اس ذمّہ داری کی ادائیگی یا اس کی ادائیگی میں کوتاہی کی بے شمار مثالیں مسلمان ملکوں میں ملیں گی)۔ انسانی ہمدردی اور خدمت کے حوالے سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حاجت روائی ضرب المثل اور معروف ہے۔ ضرورت پڑی تو آپؐ نے مکّہ والوں کو غذائی امداد بھیجی حالاں کہ اس وقت تک مکّہ والے دائرۂ اسلام میں نہیں داخل ہوئے تھے۔ دوسرے خلیفہ، سیّدنا عمر فاروقؓ نے قحط کے زمانے میں مدینہ کی عام آبادی کو کھانا کھلانے کا انتظام کیا تھا۔ ترقّی یافتہ ممالک میں جب سے فلاحی ریاست کے تصوّر نے جڑ پکڑی ہے اس بارے میں ایک سے بڑھ کر ایک اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ آج بعض ممالک میں ہر شہری کو مفت تعلیم، علاج، نقل و حمل اور دوسری سہولتیں حاصل ہیں۔ جدید اسلامی معاشرے کو مقامی حالات اور عالمی معروفات کی روشنی میں اپنا موقف اختیار کرنا ہوگا۔

یہ مثال نسبتاً سادہ سی تھی، جس کے بارے میں زیادہ اختلاف کی گنجایش نہیں۔ اب ہم ایک دوسری مثال پیش کریں گے جس کی تفصیلات میں اختلاف کی کافی گنجایش ہے۔ انسانی عزّ و شرف بھی ایک مقصد ہے جس کے ایک تقاضے کے طور پر یہ حکم دیا گیا ہے کہ اجتماعی امور باہمی مشورے سے طے کیے جائیں۔ تکریم بنی آدم کا مقصد جبر و استبداد سے اِبا کرتا ہے۔ یہ بات کہ کچھ لوگ دوسروں پر حکم چلائیں، نسلی بادشاہی ہو، کچھ لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے فیصلوں میں شرکت سے محروم کر دیے جائیں، اسلام کو منظور نہیں۔

اس طریقے پر عمل درآمد کی کچھ مثالیں عہد نبویؐ اور خلافت راشدہؓ کے زمانے میں ملتی ہیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب مکّہ سے مدینہ آئے تو آپؐ نے آبادی کے مختلف گروہوں کو اعتماد میں لیتے ہوئے ایک ایسا دستور بنایا جس میں آپؐ حکمران تھے، مگر غیر مسلم بھی اس وفاق میں برابر کے شریک تھے۔ سیّدنا عمر فاروقؓ نے مجوسی مذہب والوں کے جذبات کی رعایت سے انھیں حفاظتی ٹیکس، جزیہ سے مستثنیٰ کرتے ہوئے ان پر دوسرا ٹیکس لگایا۔ قدیم دور میں جو نظیریں ملیں، وہ اس زمانے کے معروفات، عادات اور امکانات کو سامنے رکھ کر سمجھی جانی چاہییں۔ آج اس مقصد کو آج کی عادات، معروفات اور امکانات کو سامنے رکھتے ہوئے حاصل کرنا ہوگا۔ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دینا، غیر مسلم شہریوں کی شرکت کا خیر مقدم کرنا اور ملکی فیصلوں میں بین الاقوامی قانون اور عہد و پیمان کا لحاظ رکھنا، ایسے امور ہیں، جن کو جدید اسلامی فکر کی تائید حاصل ہے (اگرچہ اس حوالے سے اختلاف کرنے والوں کی بھی کمی نہیں۔) اس کے سوا چارہ نہیں کہ اس بارے میں اختلاف کو بھی باہمی مشوروں سے طے کیا جائے، اس شرط کے ساتھ کہ اصل مقصد نہ فوت ہو، یعنی آدم کی ہر اولاد برابر کی عزّت رکھتی ہے، جو اسے ملنی چاہیے۔

ہماری نظر مقاصدِ شریعت پر ہونی چاہیے۔ فوری طور پر حدود کے نفاذ پر اصرار سے اگر مقاصد کا حصول خطرے میں پڑ رہا ہو تو ان کی تشریح، تعبیر اور تنفیذ کے حوالے سے دیکھا جائے کہ اسلامی شریعت کے اصولوں کی پاس داری کرتے ہوئے کہاں اور کتنی گنجایش ممکن ہے۔ قیام عدل کی خاطر اور اجتماعی طور پر کفالت عامّہ کی ضمانت دینے کے لیے ملکی دستور میں مسلمان اور غیر مسلم شہریوں کو یکساں حقوق کی ضمانت دینا اس کی ایک اہم مثال ہے۔

ہم چاہیں گے کہ مسلمانوں کو اپنی اقدار و اطوار کے مطابق زندگی گزارنے کا حق ہر ملک میں حاصل ہو (جہاں وہ اکثریت میں ہوں وہاں بھی، اور جہاں وہ اقلیت میں ہوں وہاں بھی)۔ اس مقصد شرعی کے حصول کے لیے ہمیں غیر مسلم ہم وطن شہریوں کو بھی ہر ملک میں یکساں حقوق دینے چاہییں۔ اس دستور کے مطابق کسی عہدے پر کوئی بھی فائز ہو سکے گا۔ اگرچہ جدید بندوبست میں کسی بھی عہدے دار کو فیصلہ کن اختیارات نہیں ملتے بلکہ انتظامیہ، مقنّنہ اور عدلیہ کے الگ الگ دائرۂ کار مقرر کر کے مطلق العنانی پر قابو پانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ماضی میں اس کی نظیر نہ ملنا اس بات کی دلیل نہیں کہ یہ موقف غلط ہے۔ یہ دیکھنا ہے کہ مقاصد کے حصول کا بہتر طریقہ کیا ہے؟

حصول مقاصد کے لیے درکار فضا

سب انسانوں کے لیے بہتر ہوگی ایک ایسی دنیا، جس میں ہر ملک میں ہر فرد کو یکساں حقوق حاصل ہوں۔ اُسے اختیار ہو کہ وہ جس مذہب پر چاہے عمل کرے، یا کسی مذہب کو نہ مانے۔ جس میں ہر ایک کو دوسروں کے سامنے اپنے خیالات اور عقائد کی تبلیغ کا حق ہو۔ جس میں ہر مذہبی گروہ کو خاندانی زندگی اپنے پرسنل لا کے مطابق منظّم کرنے کا حق ہو، جو شخص کسی مذہبی پرسنل لا کی پابندی نہ پسند کرے اسے متبادل سول لاز کی تشکیل میں حصّہ لینے کا حق ہو۔ باقی امور میں قانون سازی ایک ایسے فورم کے ذریعے عمل میں آئے، جس میں ہر فرد کو اپنی بات دلیل کے ساتھ پیش کرنے اور دوسروں کو سمجھانے کا موقع ملے۔ اور جب ایک قانون بن جائے تو اس میں تبدیلی لانے کے مواقع بھی میسّر ہوں۔

سب کے لیے اچھّا ہوگا کہ کوئی ملک جو دوسرے ملکوں پر اپنی چودھراہٹ جمانے کی کوشش نہ کرے۔ امن کا قیام، باہمی جھگڑوں کا خاتمہ، اظہارِ خیال کی آزادی یہ سب اُمور..... مقاصد شریعت میں سے ہیں۔ آج کے حالات میں جب دنیا ایک آبادی میں تبدیل ہو چکی ہے (جس میں ہر رنگ و نسل، ہر مذہب کے لوگ مل جل کر رہتے ہیں اور ایک دوسرے سے لین دین، عہد و پیمان کے تعلّقات رکھتے ہیں) اس مقصد کے حصول کے لیے ایسی ہی فضا درکار ہے۔ انیسویں صدی کی وہ دنیا جس میں ایک ملک میں زیادہ تر ایک طرح کے لوگ رہتے تھے۔ ہر ملک خودمختاری کے دعوے کے ساتھ خود کو اس بات کا مجاز سمجھتا تھا کہ ملک کی آبادی کی اکثریت کی راے کے مطابق ایک نظام نافذ کرے اور باقی آبادی کو (جو اقلیتوں پر مشتمل ہو) چند بنیادی حقوق کی ضمانت دے۔ دوسرے ملکوں کو اس کی اجازت نہ تھی کہ وہ کسی خودمختار مُلک کے اس اختیار میں مداخلت کریں، لیکن وہ دنیا اب داستان ماضی بنتی جارہی ہے۔ اب دنیا کے سارے ملک متعدد بین الاقوامی معاہدوں کے پابند ہیں۔ کسی ملک میں کوئی گروہ خواہ وہ اقلیّت میں ہی کیوں نہ ہو، اکثریت اس پر اپنی مرضی نہیں تھوپ سکتی۔ عملی طور پر اس نقشے کے خلاف بہت کچھ ہوتا نظر آتا ہے، مگر عالمی طویل المیعاد رجحان یہی معلوم ہوتا ہے۔

مقاصد اور لچک

تحصیل مقاصد میں لچک کی ایک مثال وہ حکمتِ تدریج ہے، جو اسلام نے غلامی کے رواج

کو ختم کرنے کے سلسلے میں اختیار کی۔ ساتویں صدی کی دنیا، بالخصوص جزیرۃ العرب میں جنگی قیدیوں کو غلام بنالیا جاتا تھا، مفتوحہ عورتوں کو لونڈی بنالیا جاتا تھا۔ پوری معیشت بھی غلامی پر قائم تھی۔ اس رواج کو رفتہ رفتہ ختم کرنے کے لیے اسلام نے متعدّد اقدامات کیے۔ حالت امن میں آزاد انسان کو پکڑ کر غلام بنا لینے کو قطعاً ممنوع قرار دیا، غلاموں کو اپنی آزادی خریدنے کی ترغیب دی اور ہمّت افزائی کی، اور غلام کے مالک کے لیے ضروری قرار دیا کہ وہ اسے معاوضہ لے کر آزاد کرنے پر راضی ہو۔ جن لونڈیوں کے یہاں اپنے مالک سے اولاد ہو، ان کو مالک کی وفات کے بعد آزاد قرار دیا، اور جنگی قیدیوں کو فدیہ کے عوض یا بلا معاوضہ (بطور احسان) رہا کرنے کی ہدایت دی۔ ان اقدامات کے باوجود دنیاے اسلام میں غلامی اس وقت تک جاری رہی جب تک مغربی اقوام نے اس کے خاتمے کے لیے قدم نہ اٹھایا تو اس کی ذمّہ داری ان مسلمان حکمرانوں پر تھی جنھوں نے اپنے مفادات کے لیے غلامی کو باقی رکھا۔ ورنہ اسلام کا منشا یہ نہ تھا کہ غلامی، دائماً باقی رہے۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں غلاموں کے ساتھ حُسن سلوک اور ان کے حقوق ادا کرنے کی واضح تاکید کی تھی۔ یہی نہیں، ابنِ ماجہ کی روایت کے مطابق بسترِ مرگ پر بھی آپؐ کی وصیّت میں اس امر کی تاکید شامل تھی۔

اب دنیا میں قانوناً غلامی ختم ہوئی، دنیا میں رائج قانون کے مطابق کسی حال میں کسی انسان کو غلام نہیں بنایا جاسکتا۔ غور کیجیے تو مقصد تخلیق کا تقاضا ہے کہ انسان آزاد ہو، غلامی دنیوی زندگی کی امتحانی کیفیت کے ساتھ مناسبت نہیں رکھتی۔ اِنسان کی آزادی مقصود ہے۔ اس لیے کہ انسان آزاد حالت میں دنیا میں بھیجا گیا تھا، ہر انسان آزاد پیدا ہوتا ہے اور اسے آزاد ہی رہنا چاہیے۔ تاریخ انسانی میں اس اصول کی خلاف ورزی (جو انسانوں کے ایک گروہ نے مرضیِ الٰہی کے خلاف کی تھی) اس کا سلسلہ اب نبیِ آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھوں ختم ہوا۔ یہ مقاصد میں لچک کی ایک مثال تھی۔ حالات کی بنا پر مقصد کی تکمیل کے لیے مناسب حالت تک پہنچنے میں تاخیر ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اب ایک بار مقصد کے مطابق حالت حاصل ہو جانے کے بعد پچھلی حالت کی طرف واپسی نا قابل قبول ہے۔ حال کے چند برسوں میں اس کے برعکس موقف بعض احباب نے پیش کیا ہے۔ اُن کی بات مقصد تخلیق اور مقاصد شریعت دونوں سے ٹکرانے کی بنا پر نا قابل قبول ہے۔

مقاصد کے مآخذ

سطورِ بالا میں ہم نے یہ سوال اٹھایا تھا کہ مقاصد کہاں سے اخذ کیے جائیں؟ اصولاً اِس سوال کا جواب یہ ہے کہ مقاصد کا ماخذ قرآن وسنّت ہیں، ساتھ ہی ان کی پہچان اور تعبیر میں عقل وفطرت کا بھی حصّہ ہے۔ انسان کی اصل مطلوب حالت آزادی اور خود اختیاری کی حالت ہے۔ یہی خلافت ارضی اور اُخروی جواب دہی سے مناسبت رکھنے والا موقف ہے۔ اب اگر کوئی کتاب وسنّت کی بعض نصوص سے استدلال کرتے ہوئے جن کا تعلّق غلامی سے ہے، غلامی کے تسلسل یا احیا کا دعویٰ کرے تو اس کا یہ دعویٰ اس لیے نہیں قبول کیا جائے گا کہ وہ معیارِ مقصود سے ٹکراتا ہے جو چاہتا ہے کہ ہر فرد انسانی اپنے فیصلے خود کرے۔ یہی عقل کا تقاضا ہے اور فطرت کے مطابق ہے۔ کتاب وسنّت کی نصوص کو مقاصد کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ مقصد تخلیق آیات محکمات سے واضح ہے اور مقاصد شریعت قرآن وسنّت کی نصوص کے مجموعے سے سمجھے گئے ہیں۔ کسی ایک باب میں ان دونوں کو پس پشت ڈال کر اختیار کیا ہوا موقف درست نہیں ہوسکتا۔

اسی قسم کی ایک دوسری مثال جنگ کے نتیجے میں قبضے میں آنے والی زمینوں، دوسرے غیرمنقولہ اثاثوں اور منقولہ دولت کی ہے۔ اس بارے میں بھی معروفات بدلتے رہے ہیں اور ان کے بدلنے کے ساتھ اسلامی بندوبست بھی بدلا ہے۔ آج یہ پورا معاملہ 'جنیوا کنونشن' اور دوسرے متعلقہ معاہدوں کے تحت آتا ہے، جن کی پابندی کا ہر ملک نے عہد کیا ہے۔ ماضی میں بھی اس کی مثال موجود ہے۔ بعض صحابیوںؓ کے اصرار کے باوجود حضرت عمرؓ نے عراق وشام کی مفتوحہ زمینوں کو ان فوجیوں کے درمیان تقسیم نہیں کیا جنھوں نے لڑ کر اس علاقے کو فتح کیا تھا، کیوں کہ ایسا کرنے سے اعلیٰ تر مقاصد مجروح ہوتے۔ اب اگر کوئی گروہ غنیمت کی تقسیم سے متعلّق آیات کا حوالہ دے کر عرف عام اور معاہدوں کے خلاف عمل کرے تو اس کا فیصلہ درست نہیں قرار دیا جائے گا۔

اسلامی تحریکات

اسلامی تحریکات بیسویں صدی کے شروع میں ابھریں۔ انھوں نے بیسویں صدی کے وسط تک وہ شکل اختیار کر لی، جو آج ان کی پہچان بن چکی ہے۔ تحریکوں کے ظہور اور ارتقا کے وقت ان کے سامنے مخصوص حالات تھے۔ ان کے میدان کار میں یہ سوال اٹھ چکا تھا کہ اجنبی حکومت کے

خاتمے کے بعد (جس کی تشکیل میں ان ملکوں کے باشندوں کا کوئی دخل نہ تھا) ملک میں ریاست کی تشکیل کن اصولوں کے مطابق ہو؟ قدرتی طور پر وہ تحریکیں یہ مطالبہ کرنے لگیں کہ آزاد قومی حکومت اللہ کی حاکمیت کے تحت کتاب وسنّت میں دیے گئے اصولوں کے مطابق تشکیل پائے۔ دنیا میں آج کے ماحول میں حاکمیّت اعلیٰ کی بحث اب سرِ فہرست نہیں رہی۔ ایک ملک پر دوسرے ملک سے آئے ہوئے لوگوں کی حکومت کا زمانہ گزر گیا تو حاکمیّت اعلیٰ کی بحث بھی پسِ پشت چلی گئی اور اسی کے ساتھ ملکی دستوروں میں حاکمیّتِ الٰہی کی صراحت بھی تحصیل حاصل سمجھی جانے لگی۔ اب دوسرے ملکوں کی طرح مسلم اکثریت والے ممالک بھی کچھ عملی مسائل کے حل تلاش کر رہے ہیں اور وہاں کام کرنے والی تحریکوں کو ان مسائل کا حل پیش کرنا ہے۔

رہے غیر مسلم اکثریت والے ملک، تو وہاں اصل مسئلہ اسلام کے تعارف اور پیغمبرؐ اسلام کے مشفقانہ (یعنی محسنِ انسانیتؐ ہونے کے) تصوّر سے متعارف کرانے کا ہے۔ آج کسی جگہ بھی وہ سوالات سرفہرست نہیں جو گذشتہ صدی کے وسط تک سرفہرست تھے۔ غور سے دیکھیے تو ان ملکوں میں (خواہ مسلم اکثریتی ممالک ہوں یا وہ ممالک جہاں مسلمان اقلیّت میں ہیں) چلنے والی اسلامی تحریکوں کے عملی طور طریقے بھی عملاً بدل چکے ہیں۔ انھوں نے بدلے ہوئے حالات میں بدلے ہوئے طریقے بھی اختیار کرنا سیکھ لیا ہے۔

فکرمندی کی بات یہ ہے کہ ابھی تک ان نئے رجحانات کے بیان اور توجیہ وتشریح پر مشتمل خاطر خواہ لٹریچر نہیں تیار ہوسکا ہے۔ چنانچہ ایک طرف ماضی کے مخصوص حالات کی پیداوار لٹریچر کو اس طرح پیش کرنے کا سلسلہ جاری ہے جیسے وہ زمان ومکان سے بلند ہو۔ دوسری طرف حکمت عملی کے نام پر ایسے اقدامات کیے جاتے ہیں جن کو پرانے لٹریچر کے پروردہ ذہن سمجھ نہیں پاتے۔

اس سے دو طرح کی خرابیاں جنم لیتی ہیں: ایک طرف ضمیر ملامت کرتا ہے کہ حالات اور رائے عامّہ کے دباؤ کے تحت عزیمت کی راہ چھوڑی جا رہی ہے۔ خیال آتا ہے کہ ہونا یہ چاہیے تھا کہ اسلامی ریاست قائم کرنے کے مقصد کے تحت ایسا دستور بنایا جائے جو شریعت اسلامی کو ملکی قانون قرار دیتا ہو، صدر مملکت کا مسلمان ہونا ضروری قرار دیتا ہو، وغیرہ وغیرہ۔ مگر سوال یہ ہے کہ (اسلامی دستور سازی کی) اس تجویز کو کثرت رائے سے منظور کرانا ممکن نہ ہو، اور اسے بزورِ قوت

نافذ کرنے کے لیے فوج ساتھ دینے کو تیار نہ ہو، یا فوج بھی اس کی طاقت نہ رکھتی ہو، تو کیا کیا جائے؟ مسلم ضمیر حیران ہے کہ ایسی صورتِ حال میں کیا کیا جائے؟

دوسری خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ ایسے میں بعض مسلمان گروہ یہ خیال کرتے ہیں کہ عوام کو ساتھ لینے کی کوشش جس کو اسلامی تحریکات نے اسلامی ریاست قائم کرنے کی شرطِ لازم سمجھ رکھا ہے ''غیر ضروری ہے۔ جب جہاں موقع ملے اسلامی قانون کی حکمرانی کا اعلان کر دینا چاہیے''۔ عملاً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ ایسے گروہ اسلامی قانون کا جو نفاذ کرتے ہیں وہ چند جرائم کی سزاؤں، یعنی حدود کے نفاذ تک محدود رہتا ہے۔ شریعت کے بڑے بڑے مقاصد اُن کی توجہ مبذول نہیں کرا پاتے، مثلاً: قیامِ عدل، کفالت عامّہ، شاملہ اور معقول تقسیم دولت، آمدنی میں پائے جانے والے فرق کو کم کرنا، ملک کو اقتصادی طور پر مضبوط بنانا، تاکہ دوسروں کی محتاجی ختم ہو، کرپشن کا خاتمہ اور اعلیٰ کارکردگی کی حامل انتظامیہ کی بحالی۔ اِن مقاصد کے حصول کی کوشش کم ہی نظر آتی ہے۔ مزید برآں ان گروہوں کے جابرانہ اقدامات کا ہدف زیادہ تر دوسرے مسلمان ہی ہوتے ہیں۔ ان کے نفاذِ حدود پر مرکوز اقدامات سے مقامی اور عالمی دونوں سطحوں پر اسلام سے توحّش پیدا ہوتا ہے، اسلام کی ترجیحات کے بارے میں شدید غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور متعدد اسلامی مقاصد مجروح ہوتے ہیں۔ نیز بزعمِ خود جو محدود مقاصد وہ حاصل کر پاتے ہیں، وہ دیرپا نہیں ثابت ہوتے۔ ان کی ایسی ہی حرکتوں سے غیر مسلم اکثریت والے ملکوں میں اسلام کی بدنامی ہوتی ہے اور پیغمبرؐ اسلام کی تصویر بگڑتی ہے اور مسلم ممالک میں اسلامی تحریکات کو شبہے کی نظر سے دیکھا جانے لگتا ہے۔

مشکل یہ ہے کہ اکثر مخلصین یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ: ''اسلامی تحریک ہر زمان و مکان میں ایک لگا بندھا طریقہ اختیار کرنے پر مامور ہے''۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تحریک اپنے مقصود، اللہ کے بندوں کو بندگیِ ربّ کی طرف بلانے کے لیے حالات کی مناسبت سے مختلف طریقے اختیار کر سکتی ہے، کسی لگے بندھے اور غیر لچک دار طریقے کی پابند نہیں۔

اسوۂ نبویؐ

اس مرحلے میں ضروری ہے کہ ہم یہ دیکھیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حالات کا مقابلہ کس طرح کیا۔ تفصیلات میں جائے بغیر ہم یہ بتانا چاہیں گے کہ مقاصد سے وابستگی کے ساتھ

حدود اور ذرائع میں لچک کی تعلیم ہمیں سیرتِ مطہرہؐ میں ملتی ہے۔ کارِ نبوت کی انجام دہی سے متعلّق جن مختلف حالات کی طرف ہم قارئین کی توجّہ مبذول کرانا چاہیں گے وہ درج ذیل ہیں:

○ شعب ابی طالب میں محصوریت ○ طائف کے داعیانہ سفر سے واپسی پر شہر مکّہ میں سکونت کا مسئلہ ○ ہجرت حبشہ اولیٰ اور ہجرت حبشہ ثانیہ ○ بیعتِ عقبہ، اولیٰ و ثانیہ ○ مدینہ پہنچنے پر مواخات کی تنظیم ○ مسجدِ نبویؐ کی تعمیر اور مسلمانوں کے لیے بازار کا قیام ○ میثاق مدینہ ○ صلح حدیبیہ ○ فتح مکّہ پر عام معافی کا اعلان ○ غزوۂ حنین کے موقعے پر تقسیمِ غنائم میں مکّہ والوں کو ترجیح ○ خطبہ حجّۃ الوداع۔

سطورِ بالا میں مقاصد اور ذرائع، حدود میں لچک، وغیرہ امور پر گفتگو سے ہمارا منشا یہ تھا کہ ایسے غور و فکر کا آغاز کریں جو آج اور آیندہ کے ممکنہ حالات میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے اور ان کو عام انسانوں کے درمیان مقبول بنانے میں مددگار ہو سکے۔ نیز مسلمانوں کو اس مخمصے سے نکال سکے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، یعنی یہ کہ ہم بدلے حالات میں مناسب نئے طریقے کس بنیاد پر اختیار کر سکتے ہیں؟

ایک دقّت یہ ہے کہ بعض لوگ اسوۂ نبویؐ سے استشہاد میں ہر طرح کے حالات کا احاطہ کرنے کے بجاے اپنی پسند کی نظیریں پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ یہی طریقہ وہ بعد کی صدیوں میں اسلامی تاریخ کے مطالعے کے بارے میں اختیار کرتے ہیں۔ اس غلطی کا ازالہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ قرآن و سنّت، سیرت نبویؐ اور اسلامی تاریخ کا مطالعہ پہلے سے اختیار کیے ہوئے کسی موقف کی تائید کے لیے نظیریں جمع کرنے کے لیے نہ کیا جائے، بلکہ کھلے ذہن کے ساتھ کیا جائے۔ اس کے باوجود، مختلف مطالعہ کرنے والے مختلف نتیجے نکالیں تو تبادلۂ خیال کے ذریعے ایک رائے تک پہنچنے کی کوشش کریں، اور اتفاق رائے نہ ہو سکنے کی صورت میں رواداری سے کام لیں۔ ایک دوسرے کو کافر یا گمراہ قرار دینے اور مرنے مارنے پر نہ اتر آئیں۔ مذکورہ بالا ابواب سیرت کا مطالعہ ابن ہشام کی السیرۃ النبویہ یا تاریخ اسلامی کی کسی مستند کتاب میں کیا جا سکتا ہے۔ یہاں ہم تفصیلات بیان کرنے کے بجاے صرف اس سبق کو یاد دلانے پر اکتفا کریں گے، جو کسی خاص واقعے سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

● حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں جب قریش نے ان کے سارے رشتہ داروں کا بائیکاٹ کیا، تو ان کے چچا ابوطالب کو جو خاندان کے سربراہ تھے، سارے خاندان کو لے کر مکّہ کی ایک بے آب و گیاہ وادی میں رہایش اختیار کرنا پڑی۔ ان ہی کے نام پر اس وادی کا نام شعب ابی طالب پڑ گیا۔ وادی میں محصور ہونے والوں کی بھاری اکثریت ابھی اسلام میں نہیں داخل ہوئی تھی، مگر قبائلی رواج کے مطابق آپؐ کا ساتھ دے رہی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ رسولؐ اللہ نے اس رواج سے پورا فائدہ اٹھایا۔ اپنے قبیلے سے کٹ کر مسلمان ہونے والے اہلِ قبیلہ کی الگ دنیا بسانے کی کوشش کے بجاے چچا ابوطالب اور دوسرے اہلِ قبیلہ کے تعاون و یک جہتی کو خوش آمدید کہا۔

● ایک وقت آیا جب آپؐ مکّہ والوں کی بے رخی کے سبب شہر چھوڑ کر قریب کے دوسرے شہر طائف گئے، تاکہ انھیں اسلام کی طرف بلائیں، مگر ان کی طرف سے مکّہ والوں سے بدتر سلوک سامنے آنے پر واپس آنا پڑا۔ اب مشکل یہ آن پڑی کہ جس طرح آپؐ شہر چھوڑ کر گئے تھے، اس کے بعد دوبارہ مکّہ میں سکونت اختیار کرنے کے لیے آپؐ کو شہر کے کسی با اثر باشندے کی سرپرستی درکار تھی۔ چنانچہ ایک صاحب کی پیش کش قبول کر کے آپؐ دوبارہ مکّہ میں رہنے لگے۔ یہ صاحب بھی ابھی دائرہ اسلام سے باہر تھے۔ اس واقعے سے سبق یہ ملا کہ: اسلامی مقصد کے حصول کے لیے معروفاتِ وقت سے استفادہ کیا جانا چاہیے۔

● 'حبشہ' جزیرۃ العرب سے باہر (مگر ایک آبنائے کے فرق سے) اس سے متّصل ملک ہے جس میں عیسائی آباد تھے۔ بادشاہ بھی عیسائی تھا اور اپنی سلامت طبع اور عدل وانصاف کے لیے مشہور تھا۔ جب مسلمان ہونے والوں پر مکّہ والوں کا ظلم وستم بہت بڑھا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مشورہ دیا کہ مسلمان وہاں جا بسیں۔ چنانچہ پہلی بار درجن بھر اور دوسری بار سو کے قریب مسلمان وہاں جا بسے۔ باوجود مکّہ والوں کی کوشش کے، حبشہ کے نیک بادشاہ نے وہ تحفظ برقرار رکھا جو پناہ گزینوں کی حیثیت میں ان مسلمانوں کو معروف کے مطابق حاصل ہوا تھا۔ اس ہجرت کا سبق واضح ہے کہ مقاصد کے حصول کے لیے، بہتر صورتِ حال سے استفادہ کرنا چاہیے۔

● نبی صلی اللہ علیہ وسلم، حج کے موقعے پر باہر سے آنے والے لوگوں سے ربط قائم کرتے اور انھیں اسلام کی دعوت پہنچاتے۔ ایک بار ایسا ہوا کہ یثرب (جو بعد میں مدینہ کے نام سے مشہور ہوا)

سے آئے ہوئے لوگوں نے آپؐ کو وہاں آ بسنے کی دعوت دی۔ دراصل وہ لوگ شہر یثرب میں آباد قبیلوں کے باہمی اختلافات سے تنگ آ چکے تھے اور اُمید کرتے تھے کہ آپؐ کی منصفانہ سرپرستی سب کے لیے رحمت ثابت ہوگی۔ جب دوسرے سال وہاں کے ایک زیادہ نمایندہ گروپ نے اسی پیش کش کا اعادہ کیا، تو آپؐ نے ان کی درخواست قبول کرلی، البتہ اس پر عمل درآمد کب ہوگا اسے مشیتِ الٰہی پر چھوڑ دیا۔ یہ بھی موقعے کی مناسبت سے ایک جرأت مندانہ فیصلے کی اہم مثال ہے۔

● جب سو سے زیادہ مسلمان اور خود محمد نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ پہنچے، تو ان کے ہاتھ خالی تھے اور فوری حل طلب مسئلہ یہ تھا کہ وہ رہیں کہاں؟ آپؐ نے آنے والوں کو مقامی مسلمانوں کا بھائی بنا کر ان کے گھروں میں ٹھیرا دیا۔ یہ بندوبست دو سال چلا، جس کے بعد مکّہ سے آنے والے یہ مہاجر رفتہ رفتہ اپنے پیروں پر کھڑے ہوگئے۔ غیر معمولی حالات میں مناسب انتظام کیا گیا۔ اس انتظام میں انفرادی ملکیت وغیرہ کے وہ ضوابط مانع نہ ہوئے جو پہلے سے موجود تھے اور جن کا آیندہ بھی التزام رہا۔

● نبی کا بنیادی کام رہنمائی، روحانی تزکیہ اور لوگوں کی اخلاقی اصلاح ہے۔ معمول کے اُمورِ دنیا لوگ خود سنبھال لیتے ہیں، مگر بعض کام ایسے بھی ہیں جن کے دُوررس اثرات تقاضا کرتے ہیں کہ ان کی طرف خصوصی توجّہ کی جائے۔ مدینہ کے بازاروں پر یہودی چھائے ہوئے تھے اور ان کا رویّہ مسلمانوں کے تئیں اچھا نہیں تھا۔ چنانچہ مسجدِ نبویؐ کی تعمیر کے ذریعے مسلمانوں کو ایک مرکز سے منسلک کرنے کے بعد آپؐ نے ان کے لیے ایک بازار قائم کرنے کا اہتمام کیا اور اس کی نگرانی خود فرمایا کرتے تھے۔

● 'میثاق مدینہ' پر ڈاکٹر محمد حمیداللہ [م: ۲۰۰۲ء] نے تفصیلی بحث کی ہے۔ مدینہ شہر کی آبادی، جس میں مقامی مسلمان، مکّہ سے آئے مسلمان، یہودی، عیسائی اور کچھ دوسرے مسلکوں والے شامل تھے، ان سب کو شہر کے انتظام وانصرام کے لیے ایک وفاقی نظام دینے والی یہ دستاویز یہ سبق دیتی ہے کہ: 'حکومت آبادی کی مرضی سے بنتی ہے اور ان کی ہمہ جہتی عام فلاح و بہبود کے لیے ہوتی ہے'۔

● صلح حدیبیہ کا پس منظر یہ ہے کہ عمرہ پر آئے مسلمانوں کو واپس جانے پر مجبور کر کے

قریش عرب کے معروف رواج کی خلاف ورزی کر رہے تھے۔ منشأ یہ تھا کہ ان کی ناک اونچی رہے۔ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے طویل المیعاد فوائد پر نظر رکھتے ہوئے اپنی بات پر اُڑنے کے بجاے صلح کو ترجیح دی اور ان چھوٹی باتوں کو صلح کی راہ میں روڑا نہ بننے دیا، جو صلح نامے پر دستخط کے وقت پیش آئیں۔ صلح حدیبیہ کی پوری تفصیلات پیش آنے والے مسائل میں مقاصد پر مرکوز غیر جذباتی رویے اختیار کرنے کا سبق دیتی ہیں، تاکہ امّت کا مستقبل بہتر بنایا جاسکے۔

● یہی سبق فتح مکّہ کے بعد عام معافی کے اعلان سے بھی ملتا ہے۔ مکّہ ایسے افراد سے بھرا ہوا تھا، جنھوں نے فاتحانہ داخل ہونے والی فوج میں شامل افراد پر ظلم وستم کے پہاڑ ڈھائے تھے۔ انھوں نے خود اللہ کے رسولؐ پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔ مگر آپؐ نے ان باتوں کو نظرانداز کیا تاکہ مستقبل کے تعلّقات کو تلخی سے بچایا جاسکے اور باہمی رشتوں کو ماضی کی تنگنائے سے نکال کر امن وآشتی کی نئی بنیاد پر قائم کرنا ممکن ہوسکے۔

● عام اصول کے مطابق مالِ غنیمت میں سارے فوجیوں کو حصّہ دیا جاتا رہا تھا مگر غزوۂ حنین کے اموالِ غنیمت آپؐ نے زیادہ تر مکّہ والوں کو دیے، جو ابھی نئے نئے مسلمان ہوئے تھے۔ مدینہ سے ساتھ آنے والے بعض پرانے جاں بازوں نے کچھ جز بز بھی کیا مگر آپؐ نے انھیں اعتماد میں لے کر مسئلہ حل کرلیا۔ حالات کی مناسبت سے عمل میں لچک وسیع تر مقاصد کے حصول کے لیے زیادہ مفید ہوتا ہے۔

● حجّۃ الوداع کے تاریخی خطبے میں جن باتوں کا ذکر ہے ان سے بجا طور پر یہ تاثّر ملتا ہے کہ: وحدت بنی آدم، انسانی شرف وعزّت، اور سماجی عدل کا قیام مقاصد شریعت میں سرفہرست ہے۔ جن چار باتوں کی طرف نبی کریمؐ کے آخری خطبے میں خصوصی توجّہ دلائی گئی وہ ہیں: انسانی مساوات، غلامی کا مسئلہ، صنف نازک کے ساتھ سلوک، اور سود کا خاتمہ۔ ان چاروں میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ طویل المیعاد کام ہیں، جن کا تعلّق طرزِ فکر اور طرزِ عمل سے بھی ہے اور سماجی اداروں سے بھی۔ انھیں صرف قانون سازی سے نہیں انجام دیا جاسکتا۔ آغازِ نبوت میں آپؐ کے گردوپیش جو صورتِ حال تھی، وہ بہت ہی ناپسندیدہ اور بُری تھی۔ ۲۳ سال کی کوششوں سے بڑا فرق آیا، مگر بہتری کی کوشش برابر جاری رکھنے کی تاکید ضروری تھی، جو آخری تقریر میں کی گئی، تاکہ

صورت حال کو بہتر سے بہتر بنانے کا سلسلہ جاری رہے۔ یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا ان مثالوں کا تفصیلی مطالعہ حکمت کے نئے سبق سکھا سکتا ہے۔ دنیا میں حالات بدلتے ہیں۔ ہر بار ایک نئی صورت حال درپیش آتی ہے۔ ہر بار ایک نئے انداز کا حل درکار ہوتا ہے۔ اس بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلامی تحریک کسی لگے بندھے لائحۂ عمل کی پابند نہیں، بس مقاصدِ اسلام سے وابستگی شرط ہے۔ اس کے ساتھ کتاب وسنّت، سیرت وتاریخ، عقل وفطرت اور باہمی مشاورت اور تجربوں سے سبق حاصل کرنا لازم ہے۔ آج کے حالات میں اسلامی تحریکات کا مستقبل اس بات پر منحصر ہے کہ وہ نئے حالات میں نئی بات، نئے انداز سے، نئے مخاطب لوگوں کے سامنے رکھنے میں کتنی مستعدی، حاضر دماغی اور دانش مندی دکھاتی ہیں۔

یہ مسئلہ کسی ایک تنظیم کا نہیں ہے۔ تنظیمیں بنتی اور ٹوٹتی رہتی ہیں مگر مجموعی طور پر آثار اُمیدافزا ہیں۔ تشویش اس بات کی ہے کہ نئے حالات کے تجزیے، کتاب وسنّت، تاریخ وسیرت اور تجربات سے سبق سیکھنے اور کھلے ذہن سے باہم تبادلۂ خیال کا خاطر خواہ اہتمام نہیں کیا جارہا ہے۔ اس کے لیے ہمارے مدارس، جامعات، تعلیم گاہوں، یونی ورسٹیوں اور منبر ومسجد، گھر و بازار سب کو ایسا کردار ادا کرنا ہوگا جو ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے لیے سازگار ہو۔

نئے حالات، نئے امکانات

آج دنیا بڑے تشویش ناک حالات سے دوچار ہے۔ اسلام اور مسلمان انسانیت کی مدد کے لیے آگے بڑھ سکیں تو انھیں خوش آمدید کہا جائے گا۔ آیندہ سطور میں ہم یہی بات قدرے تفصیل سے پیش کریں گے۔

مسائل کی فہرست تو بڑی لمبی ہے مگر ہم تین اہم مسائل کے ذکر پر اکتفا کریں گے، جن کا تعلّق بالترتیب: آب وہوا، فنانس اور نظام زر اور خاندان اور سماجی رشتوں سے ہے، یعنی ماحولیات، مالیات اور سماجیات۔ مسائل کے ذکر کے بعد ہم یہ بتائیں گے کہ اسلامی تعلیمات کس طرح ہمیں ان مسائل کا سامنا کرنے میں مدد کرتی ہیں۔

● **ماحولیات**: آب وہوا بدل رہی ہے۔ زمین پر مضرصحت گیسیں اتنی زیادہ مقدار میں خارج ہونے لگی ہیں کہ کرّہِ ارض کو سورج کی تمازت سے بچانے کے لیے قدرت نے اس کے گرد

اوزون گیس کا جو غلاف بنا رکھا ہے، اس میں شگاف پڑتے جا رہے ہیں۔ اس کی وجہ سے درجۂ حرارت بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے قطب شمالی کی برف پگھل رہی ہے، جو پانی بن کر سطحِ سمندر کو اُونچا کر رہی ہے۔ ڈر یہ ہے کہ ساحلی علاقوں اور بہت سے جزیروں پر آباد بستیاں جلد زیرِ آب آجائیں گی۔ بہت سے پرندے اور کیڑے مکوڑے ختم ہوتے جا رہے ہیں جس کے سبب ماحولیاتی توازن درہم برہم ہو رہا ہے۔ یہ عمل زمین کے اوپر بھی ہو رہا ہے اور نیچے، سمندروں کی تہ میں بھی جاری ہے۔ موسم بدل رہے ہیں، طوفان زیادہ آنے لگے ہیں اور ہواؤں، نیز سمندری لہروں کا نظام گڑبڑ ہو رہا ہے۔ پینے کے لائق پانی کے زیرِزمین خزانے تیزی سے ختم ہو رہے ہیں۔ اس مسئلے کے حل کے لیے رہن سہن کے طریقوں میں کچھ بنیادی تبدیلیاں ناگزیر ہیں۔

● **مالیات**: حالیہ مالیاتی بحران نے ترقّی یافتہ ممالک سمیت پوری دنیا کو پریشان کر دیا ہے۔ سب سے زیادہ مشکل ان غریبوں کو درپیش ہے جن کا روزگار جاتا رہا اور ساتھ ہی ان کی بچت قوت خرید سے محروم ہوگئی۔ ۵۰ برس سے آمدنی اور دولت کی تقسیم میں جس ناہمواری کا چلن تھا، وہ یکا یک عروج کو جا پہنچا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ اوپر کے بہ مشکل ایک فی صد دولت مند دنیا کی آدھی سے زیادہ دولت کے مالک ہیں، جب کہ انسانوں کی ۹۰ فی صد آبادی کے حصّے میں کُل دولت کا ۱۰ فی صد بھی نہیں آتا۔ دنیا کی ۷ ارب کی آبادی میں ۵ ارب غریب ہیں، جن میں ۲ ارب اتنے غریب ہیں کہ انھیں ایک ڈالر روزانہ پر گزارا کرنا ہوتا ہے۔ جس طرح ہر ملک کے اندر امیر، امیر تر ہوتے گئے اور غریب، غریب تر ہوتے گئے ہیں، اسی طرح ملکوں کے مابین بھی ناہمواری بڑھی ہے۔ غریب ملک امیر ملکوں سے قرضے لینے پر مجبور ہوتے ہیں۔ جب وہ اس کا سود ادا کرنے سے بھی معذور ہو جاتے ہیں تو ان کو کفایت شعاری پر مجبور کیا جاتا ہے، جس سے ان کا اپنا امن وسکون تو غارت ہوتا ہی ہے، ایسے حالات پیدا ہوجاتے ہیں جن سے عالمی امن بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

● **سماجیات**: سب جانتے ہیں کہ انسانوں کی اگلی نسلوں کے لیے اچھّا یہ ہے کہ بچّوں کو ماں باپ کے ساتھ رہنے کا موقع ملے، لیکن اب زمینی حقائق یہ ہیں کہ طلاق کی کثرت کے سبب خاندان ٹوٹ رہے ہیں اور بچّوں کو اِدھر اُدھر بانٹا جانا ناگزیر ہو رہا ہے۔ ماضی میں یہ بھی اچھا رواج تھا کہ بزرگ والدین، یعنی دادا، دادی، نانا نانی بچّوں کے ساتھ رہتے تھے، مگر اب شہری رہایش میں

شاذ و نادر ہی ایسا ہو پاتا ہے اور پھر والد کے ساتھ والدہ کا ملازمت کرنے کا بڑھتا ہوا رواج۔ نتیجہ یہ ہے کہ بچّوں میں ذہنی امراض بڑھ رہے ہیں، اور ان کی شخصیتیں بکھر رہی ہیں۔ سماجی رشتے زیادہ تر مفادات کی روشنی میں جوڑے اور توڑے جارہے ہیں جو مفادات کے بدلنے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ رشتے پائے داری سے محروم ہیں۔ دولت کی حرص اور اعلیٰ سے اعلیٰ معیارِ زندگی کی طلب ہر چیز پر غالب ہے۔ انجام کار، سارے جتن کر کے بھی انسان خوشی سے محروم ہے۔ ایسے لوگ نایاب ہیں جو دوسرے کی بھلائی کے لیے کچھ قربانی دینے کو تیار ہوں۔ ہر طرف ایسے لوگوں کی بھرمار ہے، جو دوسروں سے تعلّق صرف اس لیے قائم کرتے ہیں کہ ان سے کچھ کام لے سکیں۔ سیاست ہو یا معیشت، غیرسرکاری ادارے ہوں یا سرکاری، ہر جگہ ذاتی مفاد کو سماجی بہبود پر ترجیح دینے والے افراد بھرے ہوئے ہیں۔

ایسی دنیا کو تباہی سے بچا سکتے ہیں تو صرف ایسے لوگ، جو رشتوں کی خاطر مفادات کی قربانی دے سکیں، سماجی بہبود کی خاطر نجی اغراض کو بھول سکیں، آنے والی نسلوں کے لیے کرۂ ارض کو بچائے رکھنے کی خاطر اپنے آرام و آسایش میں کچھ کمی برداشت کریں، کاروبار اور مالیاتی لین دین میں جس عدم تیقّن اور جن خطرات کا سامنا ناگزیر ہے، ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے دوسروں کے شریک بننے کو تیار ہوں (نہ کہ اپنی ساری ذہانت اِس پر صرف کرتے ہوں کہ کاروباری خطرات اور عدم تیقّن کو کس طرح اپنے سر سے ٹال کر دوسروں پر تھوپا جائے، نفع ہو تو ان کو ملے، نقصان پہنچے تو اسے دوسرے بھگتیں)۔ آخرت میں جواب دہی کا احساس جگا کر اور اُس دائمی زندگی کو سنوارنے کے لیے آج کے دنیوی مفادات کو ثانوی درجہ دینے کی تعلیم دے کر اسلام ایسے ہی انسان بنانا چاہتا ہے۔

تاریخ نے ایسے دور بھی دیکھے ہیں، جب سیاسی رہنماؤں نے انسانوں کی خدمت کا راستہ اختیار کیا اور کاروبارِ معیشت سنبھالنے والوں نے عام صارفین اور مزدوروں کی بھی بھلائی چاہی۔ خاندانی زندگی محبّت اور خلوص پر قائم رہی اور سماجی رشتوں کو نفع اندوزی پر ترجیح دی گئی۔ ماضی میں ہم نے دیکھا ہے کہ مذاہب عالم، بےلوث بزرگ، دانش وَر، فلسفی، شاعر، قصّہ گو، غرض ہر جہت سے اس رجحان کو تقویت ملی ہے اور آج بھی مل سکتی ہے۔ اسلام اور مسلمان ان جہتوں میں سے

ایک اہم جہت ہیں، جو دوسرے مذاہب کے مخلص پیرووں، دیگر دانش وَروں، اور اچھے انسانوں کے ساتھ مل کر مذکورہ بالا تینوں دائروں، یعنی ماحولیات، مالیات اور سماجیات، میں دنیا کو تباہی کے گڑھے میں گرنے سے بچا سکتے ہیں۔

موجودہ مسلم معاشرہ

افسوس کا مقام ہے کہ آج مسلمان یہ کردار ادا کرنے کے لائق دکھائی نہیں دیتے۔ مستقبل کی دنیا کو اپنی رہنمائی، خدمت اور تعمیری سرگرمیوں کے ذریعے سہارا دینے اور سنبھالنے کے بجاے مسلمان ماضی کے جھگڑے چکانے میں لگے ہوئے ہیں۔ انسانوں کی خدمت کی خاطر متّحد ہونے کے بجاے وہ مسلکی اختلافات اور فرقہ وارانہ تعصّبات کی بنیادوں پر بٹے ہوئے ہیں۔ اپنے خداداد کردارِ شہادت علی النّاس کی ادایگی کی خاطر یکسو ہونے کے بجاے وہ پراگندہ فکر اور پراگندہ حال ہیں۔ بڑے کاموں میں مطلوب تعاون اور تضامن کی خاطر اختلافات کو نظر انداز کر کے رواداری اور خوش خلقی کے ساتھ خدمتِ انسانیت کو اپنا ایجنڈا بنانے کے لیے ہمیں اپنی ترجیحات بدلنی ہوں گی۔

مستقبل پر توجہ کی مرکوزیت (focus)، ماضی کے اختلافات کو پسِ پشت ڈالنے کے حوصلے اور باہمی اتحاد و رواداری کے ساتھ ساتھ دنیا میں تعمیری کردار ادا کرنے کے لیے طاقت درکار ہے: اقتصادی قوت چاہیے جو مسلمان کو دوسروں کا دست نگر نہیں ان کو سہارا دینے والا بنا سکے۔ معاشی قوت تجارت سے آئے گی جس کے لیے پیداواری عمل کی عادت ڈالنی ہوگی۔ اس عمل میں انہماک خود بخود ایجاد و اختراع اور تعاون و تنظیم کی طرف لے جائے گا، جو اقتصادی قوت کی کلید ہے۔ اُمّت مسلمہ کی اٹھان میں اس پہلو نے بھی بہت اہم کردار ادا کیا تھا۔ اس کا معمار، میدانِ تجارت میں بھی رہنمائی کرتا تھا، جس نے منتشر قبائل کی توانائی کو ایک انسانی مِشن پر مرکوز (فوکس) کر کے دنیا کی تاریخ بدل دی۔ یہ آج بھی ممکن ہے۔